بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

حضرات انبیائے کرام اور داعیانِ حق جس مقصد کو لے کر اٹھتے ہیں وہ ایمان کی دعوت ہے۔ ایمان کوئی منفی چیز نہیں ہے بلکہ ایک مثبت حقیقت ہے۔ اس کا اصلی فائدہ صرف اس صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب یہ پوری طرح دل میں راسخ ہو۔ یہ استحکام و رسوخ پیدا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی بنیاد نہایت پائیدار اور محکم استدلال پر ہو۔ اس کے بغیر نہ تو یہ ایمان زندگی کے لیے ایک محرک کا کام دے سکتا، نہ اس سے تمام اعتقادی و عملی جزئیات وجود میں آ سکتیں نہ یہ زندگی کے وسیع الاطراف گوشوں میں انسان کی نگرانی کر سکتا۔ اس وجہ سے داعیانِ حق کا کام نہ تو مجرد تحکم سے چل سکتا، نہ مغالطہ سے وہ اپنا مقصد حاصل کر سکتے، نہ الزامی قسم کے دلائل ان کے کام آ سکتے، نہ محض شاعرانہ اور خطیبانہ قسم کا استدلال، جو فطرت اور عقل کے اندر اپنی کوئی اساس نہ رکھتا ہو، ان کے مقصد کو پورا کر سکتا۔ اس طرح کے سفسطہ اور الزامی و خطابی طرز استدلال سے وہ لوگ تو بے شک اپنا کام نکال سکتے ہیں جن کے پیش نظر صرف مخاطب کو ساکت کر دینا یا اس کو مغالطہ میں ڈال کر اپنا کوئی مقصد حاصل کر لینا ہو لیکن جن کے سامنے مخاطب کو چپ کرانا نہیں، بلکہ اس کی تمام قوتوں اور قابلیتوں کو صحیح راہ پر چلنے کے لیے بیدار کرنا ہو، اور جن کا مقصد لوگوں کو مسحور یا مرعوب کر کے کسی راہ پر ہانک دینا نہیں، بلکہ ان کی فطرت اور عقل کو اس طرح جگا دینا ہو کہ مشکل سے مشکل راہوں میں ہر شخص خود اپنی رہنمائی کر سکے وہ اولاً تو استدلال کی ان قسموں کو سرے سے ہاتھ ہی نہیں لگاتے، اور اگر لگاتے ہیں تو اس امر کو پوری طرح نگاہ میں رکھتے ہیں کہ ایک پاک اور اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ اس کے وسائل و ذرائع بھی نہایت پاک اور اعلیٰ ہوں۔ اس چیز نے انبیائے کرام اور داعیانِ حق کے طرز استدلال کو دوسروں کے طرز استدلال سے بالکل ممیز کر دیا ہے جس کی بعض نمایاں خصوصیات کی طرف ہم یہاں اشارہ کریں گے۔

۱۔ استدلال ہوا اور پانی کی طرح ایک عام ضرورت کی چیز ہے۔ ہر انسان زندگی کو صحیح طور پر بسر کرنے کے لیے ایمان کا محتاج ہے اور محکم ایمان بغیر محکم استدلال کے حاصل نہیں ہو سکتا اس وجہ سے استدلال کے لیے دو باتیں ضروری ہیں پہلی یہ کہ استدلال کا طریقہ اتنا فطری اور سادہ ہو کہ ہر شخص جس طرح اپنی ضرورت کے مطابق زمین اور فضا کے ذخیرۂ آب و ہوا سے ہوا اور پانی حاصل کر لیتا ہے اور اس میں اس کو کوئی خاص دقت نہیں پیش آتی اسی طرح ہر شخص زمین و آسمان کے آثار و آیات سے اپنے اطمینان قلب کے لیے جس قدر چاہے دلیلیں پیدا کر لے اور اس میں اس کو تفکر و تذکر کے سوا کسی اور چیز کا اہتمام نہ کرنا پڑے۔ دوسری یہ کہ جس طرح انسان کی جسمانی صحت کے لیے ضروری ہے کہ جس پانی کو وہ پی رہا ہے وہ صاف ہو اور جس ہوا میں سانس لے رہا ہے وہ تازہ ہو اسی طرح اس کی عقلی صحت کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ جس استدلال سے اصول زندگی حاصل کر رہا ہے وہ بالکل بے آمیز خالص اور پاک ہو۔ ان دونوں باتوں کو حاصل کرنے کے لیے حضرات انبیائے کرام اور داعیان حق کا ہمیشہ یہ طریقہ رہا ہے کہ انھوں نے ایک طرف تو استدلال و حجت کے ان مصنوعی طریقوں سے ہٹ کر اپنی راہ نکالی جو کسی قوم میں علمی و فنی ترقیوں سے پیدا ہو جاتے ہیں اور ایک خاص پیشہ ور گروہ کے سوا دوسرے اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ دوسری طرف اس تمام مواد کا انھوں نے جائزہ لیا جو استدلال و حجت کے لیے کام میں لایا جاتا ہے اور اس میں سے چھانٹ کر صرف اس چیز کو اپنے حجت و استدلال کے لیے کام میں لائے ہیں جو ہر قسم کی غیر فطری ملاوٹ سے پاک ہو۔ اس طرز استدلال کا پہلا فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ انسانوں کا ایک انبوہ عظیم جو اس سے پہلے بالکل اندھا بہرا بنا ہوا گنتی کے چند انسانوں کے پیچھے لگا ہوا ہوتا ہے دفعۃً اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور اپنے کانوں سے سننے لگتا ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اب تک سڑے گلے مواد استدلال کے نگلتے رہنے کی وجہ سے دلوں اور روحوں پر جو مردنی طاری رہتی ہے اس صالح مواد استدلال کے چند لقمے حلق سے اتارتے ہی دفعۃً دور ہو جاتی ہے اور کھانے والا اپنے آپ کو بالکل چاق و چوبند محسوس کرنے لگتا ہے۔

داعیان حق اور انبیائے کرام کے طرز استدلال کی یہی وہ خصوصیت ہے جس کی وجہ سے عقل انسانی ان کے زمانے میں کروٹ لیتی ہے اور ایک عام ذہنی بیداری ہر گوشہ میں نمودار ہو جاتی ہے یہاں تک کہ ان

گوشوں میں بھی ایک حرکت پیدا ہوجاتی ہے جہاں سے کسی اچھی خبر کی کسی کو بھی امید نہیں ہوتی۔ ہر طرف تنقید کی نگاہیں کھل جاتی ہیں۔ ہر آنکھ دیکھنے اور ہر زبان بولنے لگتی ہے۔ فکر و استدلال کے پرانے طریقے جو اب تک نہایت محبوب تھے، فرسودہ اور دقیانوسی معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اور بہت سی ایسی چیزیں جن کو ہر شخص ماخذ استدلال و حجت بنائے ہوئے بیٹھا تھا، بالکل بے مصرف اور بے وقعت ہوجاتی ہیں۔ یہ ذہنی انقلاب ان لوگوں پر بہت گراں گذرتا ہے جو........ اپنی قدیم محبوبات و مالوفات کو حق سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں اور وہ دل سے چاہتے ہیں کہ اس میں مزاحمت پیدا کریں لیکن نہ اس چیز کو روکا جا سکتا نہ اس کو روکنا صحیح ہے۔ البتہ جس چیز کی نگرانی کی ضرورت ہے وہ یہ چیز ہے کہ جو ذہنی آزادی پیدا ہو رہی ہے اس کا بہاؤ صحیح رخ پر ہو۔ اس میں بے اعتدالی اور مطلق العنانی نہ پیدا ہونے پائے۔

۲۔ انبیاء اور اہل حق کے طرز استدلال کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ صرف دلیل نہیں دیتے بلکہ مخاطب میں استدلال کی قابلیت بھی پیدا کرتے ہیں۔ اور انفرادی و اجتماعی زندگی میں جس ہمہ گیر انقلاب کی دعوت لے کر آتے ہیں وہ انقلاب اس وقت تک پائیدار بنیادوں پر قائم نہیں ہو سکتا جب تک وہ انسان کی فکری و نظری صلاحیتوں کو پوری طرح جگا نہ دیں۔ زندگی کوئی مفرد اور بسیط چیز نہیں ہے جس کو صحیح طور پر گذارنے کے لیے چند گنے چنے اصولوں کی رہنمائی کافی ہو سکے۔ یہ گوناگوں ظاہری و باطنی مطالبات و مقتضیات کا مجموعہ، بے شمار انفرادی و اجتماعی روابط و علائق کا شیرازہ، اَن گنت شخصی، عائلی اور نوعی حقوق و فرائض کا ایک گنجینہ ہے۔ پھر وہ پوری کی پوری ہماری نظروں کے سامنے موجود بھی نہیں ہے کہ ہر شخص کی گرفت میں آسکے اور تجربہ و مشاہدہ کی روشنی میں اس کی ہر حالت کیلیے پہلے سے ایک حکم معین ہو سکے۔ بلکہ اس کا ماضی اور مستقبل دونوں غیب کے پردوں میں چھپا ہوا ہے۔ صرف تھوڑا سا حاضر ہے جس کے اشارات کی روشنی میں اس کے ماضی کو بھی جاننا ہے اور اسی کی رہنمائی سے اس کے مستقبل کو بھی معین کرنا ہے۔ ایسی حالت میں زندگی کی رہنمائی کے لیے قانون و آئین کے متعین و محدود ضابطے کافی نہیں ہو سکتے، بلکہ ضروری ہے کہ اس ضابطے کے ساتھ انسان کے اندر فکر صالح کی ایک ایسی کبھی نہ بجھنے والی روشنی

بھی ہو جو زندگی کے ان مخفی گوشوں میں بھی اسکی رہنمائی کرسکے جہاں رہنمائی کیلیے اسکے پاس کوئی ضابطہ نہ ہو۔ یہ فکر صالح انبیا اور اہل حق کے طرز استدلال سے خود بخود مخاطب کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ انبیا جب اپنی اصولی تعلیمات کا آغاز کرتے ہیں تو اس کی طرح ہی اس طرح ڈالتے ہیں کہ اس فکر صالح کی تخم ریزی کے لیے خود بخود دلوں اور روحوں کے اندر زمین بھی ہموار ہوجاتی ہے اور اس کے بیج بھی پڑ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب وہ اپنے کام سے فارغ ہوتے ہیں تو ایک طرف تو شریعت کا ایک شاداب باغ تیار موجود ہوتا ہے جو ہر شخص کی نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے اور دوسری طرف حکمت کا ایک لہلہاتا ہوا چمن بھی وہ ہر قلب صالح کے اندر اگا دیتے ہیں جو اگرچہ نگاہوں کے سامنے نہیں ہوتا لیکن اس کی بہار ہمیشہ قائم ...... اور اس کی شاخیں ہر موسم میں ثمر بار رہتی ہیں۔ بظاہر تو اس کی حیثیت انبیاء کی اصل تعلیم کے مقابل میں ایک ضمنی کاشت اور ضمنی پیداوار کی ہے لیکن اپنی قدر و قیمت اور اپنے بیش بہا فوائد کے اعتبار سے یہ اصل کے برابر جگہ پاتی ہے۔ یہی چیز ہے جس کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "مجھے قرآن دیا گیا اور اسی کے مثل اسکے ساتھ ایک اور چیز" اسی شجر مبارک کے پھل پھول ہیں جو ہمیں احادیث کی صورت میں ملے ہیں۔ یہی چیز ہے جس کی نسبت قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ "جس کو یہ چیز ملی اس کو خیر کثیر کا خزانہ ملا"۔ اسی کی نسبت قرآن میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ "صرف نصیبہ ور لوگ ہیں جن کو یہ چیز ملتی ہے"۔ اور اسی کو بعض احادیث میں ایسے خزانہ سے تشبیہ دی گئی ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے۔

یہ تخلیقی صفت صرف اہل حق اور حضرات انبیائے کرام کے طرز استدلال کے ساتھ مخصوص ہے کسی مناظر اور متکلم کے استدلال میں یہ چیز آپ کو نہیں مل سکتی۔ منطقی طرز استدلال اس پہلو سے سب سے زیادہ ناقص ہے۔ منطق کو زیادہ سے زیادہ جو عزت دی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک استدلال کو اپنی کسوٹی پر جانچ کر وہ بتا سکتی ہے کہ یہ استدلال صحیح ہے یا نہیں۔ استدلال کی قابلیت پیدا کرنا اس کے بس سے باہر ہے۔ اور یہ کام بھی منطق سے صرف ایک خاص حد ہی تک لیا جاسکتا ہے۔ قرآن میں اور انبیاء کے کلام میں ہم کو استدلال کی ایسی نازک قسمیں بھی ملتی ہیں جن کو منطق کی ترازو پر سرے سے تولا ہی نہیں جاسکتا لیکن ہمارے

متکلمین، جنھوں نے منطق کو اس کی حیثیت سے زیادہ درجہ دیا۔ کوئلہ تولنے کی اس ترازو سے ان اشرفیوں کو بھی تولنا چاہا، نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں اشرفیوں کی صحیح قدر و قیمت معلوم نہ ہوسکی اور ان کو وہ کوئلوں سے بھی کم تر قرار دے بیٹھے۔

ل

اہل فلسفہ فکر انسانی کو اس بات کی ٹریننگ تو ضرور دیتے ہیں کہ وہ استدلال و استنباط کے مختلف میدانوں میں جولانی کر سکے لیکن انھوں نے اپنے مواد استدلال، طرز استدلال اور ذرائع استدلال تینوں کو رطب و یابس کا مجموعہ بنا دیا ہے جس کی وجہ سے ان کے طریقہ پر سوچنے والا انسان حیرانی و سرگشتگی کے سوا کچھ نہیں حاصل کر سکتا۔ ان کی رہنمائی میں اگر انسان چند قدم صحیح راہ میں اٹھاتا ہے تو ساتھ ہی مجبور ہوتا ہے کہ چند قدم غلط سمت میں بھی اٹھائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی ساری زندگی مختلف وادیوں کی آوارہ گردی اور اٹکل کے تیر تکے چلانے میں گذر جاتی ہے اور چند متناقض و متضاد الجھے ہوئے افکار کے سوا اس کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ اس معاملہ میں فلسفہ قدیم ہو یا فلسفہ جدید سب کا حال یکساں ہے۔ سب کے اصول فکر میں الجھاؤ اور ہر ایک کے نتائج فکر میں پریشانی ہے۔ اور اب کہ سائنس کی ترقیوں نے سارا مدار تجربہ و مشاہدہ پر قائم کر دیا ہے اور انسان اس خبط میں مبتلا ہو گیا ہے کہ دل و دماغ کی آنکھوں سے دیکھنے کے بجائے وہ سب کچھ سر کی آنکھوں سے دیکھ کر مانے گا۔ کوئی توقع ہی اس بات کی باقی نہیں رہ گئی کہ اس کا ایک قدم بھی جادۂ مستقیم پر پڑے گا۔ اب تک فلسفہ کی بنا جن اصولوں پر تھی ان میں سے بعض غلط تھے تو بعض صحیح بھی تھے جس کی وجہ سے اس کے خوابہائے پریشاں میں سے بعض خواب سچے بھی ہو جاتے تھے اور آدمی کے لیے صرف سچے اور جھوٹے میں امتیاز کی مشکل تھی لیکن اب تو سارا تکیہ حس و مشاہدہ پر ہو گیا ہے اور حس و مشاہدہ کی جہانگیری معلوم ہے کہ وہ کہاں تک ہے۔ اس کے سوا آج اگر کوئی چیز فلسفہ کے نام سے موجود ہے تو وہ اہل تشکیک کا فلسفہ ہے جس کی ساری بنیاد حواس و عقل کی بے اعتباری پر قائم ہے اور ظاہر ہے کہ یہ کوئی فلسفہ نہیں بلکہ تمام علم و فلسفہ کی کلی نفی ہے۔ اور دنیا کو حیرانی کے سوا اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

حضرات انبیائے کرام کا طریقہ استدلال نہ اہل منطق کے طریقہ کی طرح بانجھ ہے اور نہ اہل فلسفہ کے طریقہ کی طرح پریشان کن۔ بلکہ وہ فکر انسانی کی اس طرح تربیت کرتے ہیں کہ وہ خود بخود صحیح راہ پر چلنے لگے اور منزل مقصود کا سراغ ...... اس کے اندر یہ یقین پیدا کردے کہ اس نے جو راہ اختیار کی ہے وہ صحیح ہے۔ وہ پہلے تو ماخذ استدلال کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ یعنی آفاق وانفس کی طرف۔ آفاق سے مراد نظام کائنات کے آثار و آیات اور قوانین وضوابط ہیں جو اس دنیا میں ہر شخص کو ادنیٰ توجہ نظر آتے ہیں۔ نفس سے مراد وہ قوتیں اور قابلیتیں اور وہ یقینیات ہیں جن کو ہر انسان اپنے اندر دیکھتا اور محسوس کرتا ہے۔ وہ ان میں سے نمایاں چیزوں کی طرف انگلی اٹھاتے ہیں اور ان سے جو باتیں لازم آتی ہیں ان کو پیش کرتے ہیں۔ یہ پیش کرنا کبھی تو ایسی تصریح کے ساتھ ہوتا ہے کہ پوری بات بالکل بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ اور کبھی تربیت کے خیال سے ایسا بھی ہوتا ہے کہ لازمی نتیجہ کی طرف صرف اشارہ کر دیا جاتا ہے تاکہ مخاطب خود اس نتیجہ تک پہنچے۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ مخاطب میں صحیح نتائج نکالنے کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے جو زندگی کے سفر میں ہر مرحلہ میں اس کے کام آتی ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ وہ اس کو دوسرے کی بات سمجھ کر اس کی تردید یا انکار کے درپے نہیں ہوتا بلکہ اس کو خود اپنا نتیجہ فکر سمجھ کر اس کو قبول کرنے کی طرف مائل ہوتا ہے۔ تیسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس طرح مخاطب و متکلم میں استاذ و شاگرد کے بجائے باہم گر رفیق کی نسبت پیدا ہو جاتی ہے اور مخاطب میں یہ احساس کمتری نہیں پیدا ہوتا کہ میں اس نتیجہ تک دوسرے کی انگلیاں پکڑ کے پہنچا ہوں بلکہ وہ یہ خیال کرتا ہے کہ ہم دونوں مشترک طور پر اس نتیجہ تک پہنچے ہیں۔ یہ باتیں مقصد دعوت کو اتنے مختلف پہلوؤں سے فائدہ پہنچاتی ہیں کہ ان کی تفصیل کے لیے یہاں گنجائش نہیں ہے۔

یہ حقیقت محتاج بیان نہیں ہے کہ استدلال کی ساری قسموں میں فطرت انسانی سے سب سے زیادہ مناسبت رکھنے والی قسم یہی لوازم سے استدلال کی قسم ہے۔ اس وجہ سے اہل حق اور حضرات انبیائے کرام نے اس کو سب سے زیادہ برتا ہے۔ آدمی جب ایک امر کا آفاق میں مشاہدہ کرتا ہے یا اپنی

فطرت کے اندر اس کا یقین محسوس کرتا ہے تو جو باتیں اس سے لازم آتی ہیں ان کا انکار نہیں کر سکتا بشرطیکہ وہ صحیح ترتیب کے ساتھ اس کے سامنے پیش کی جائیں۔ اگر انکار کرے گا تو محض زبان سے انکار کرے گا، اس کا دل اس کے اس انکار کا ساتھ نہ دے گا۔ اور اس انکار پر اس کے لیے زیادہ دن تک جمے رہنا صرف اسی حالت میں ممکن ہے جب وہ کھلا ہوا معاند اور ہٹ دھرم ہو۔ ایک امر کے لوازم کی حیثیت اجمال کے بعد تفصیل کی ہوتی ہے اور ہر آدمی سے جس میں حق پرستی اور سچائی کی کوئی رمق باقی ہے، یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ جس بات پر مجملاً ایمان رکھتا ہے اس کی تفصیلات اور لوازم سے گریز نہ کرے گا۔ جن لوگوں نے قرآن مجید کے دلائل پر غور کیا ہے وہ ہماری اس بات کی تصدیق کریں گے کہ اس کے بیشتر دلائل کی نوعیت یہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جو شخص قرآن، اپنے دل کو ہر طرح کے تعصبات سے پاک کر کے پڑھتا ہے وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنے ہی صحیفۂ دل کی تلاوت کر رہا ہے اور اس کی ہر صدا اپنے ہی ضمیر و دل کی آواز کی طرح نئے مانوس معلوم ہونے لگتی ہے۔

۳۔ اہل حق اور انبیائے کرام کے طرز استدلال کی تیسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ عام اہل مناظرہ کی طرح مخاطب کے کسی غلط مسلّمہ کو بنائے استدلال نہیں بناتے۔ اگر ایک شخص ایک غلط بات کو مان رہا ہے تو وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی اصلاح کی جائے نہ کہ اس کی اس غلطی کی وجہ سے اس کو اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ چند اور غلطیوں کو بھی تسلیم کرے۔ جو لوگ اپنے مخاطب کو صرف خاموش کر دینے کا شوق رکھتے ہیں، یا اس کو اپنی بات کے آگے جھکانا چاہتے ہیں یا اس کو کسی مغالطہ میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں، ان کے استدلالی کارناموں میں سب سے زیادہ اہمیت اسی چیز کو حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اہل حق اس چیز سے اس حد تک گریز کرتے ہیں کہ اگر مخاطب کے کسی غلط مسلّمہ پر اپنے کسی حق کو بھی ثابت کر سکتے ہوں جب بھی وہ ایسا نہیں کرتے۔ ان کی نظروں میں اس حق کی کوئی وقعت نہیں ہے جس کی بنیاد کسی باطل پر ہو۔ اس طرح کا کھوکھلا اور بے اساس حق مناظرہ کی مجلسوں میں ممکن ہے کچھ دیر کے لیے اپنی چمک دمک دکھا دے لیکن زندگی کی مہمات میں یہ کچھ کام نہیں دیتا۔ زندگی کی مہمات میں صرف وہ

حق کام دیتا ہے جس کی........ جڑیں فطرتِ انسانی کے اندر دور دور تک پھیلی ہوئی ہوں اور اس کی وسعتوں کا یہ حال ہو کہ تمام فضا اس کے برگ و بار میں چھپ جائے۔ ہمارے متکلمین نے بالعموم یہ غلطی کی ہے کہ اسلام کے کسی اصول کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے جب انھیں اپنے گھر کی کوئی دلیل نہیں ملی تو انھوں نے دوسروں کے کسی نظریہ اور واہمہ کو اساس بنا کر اس پر اپنے مزعومات کی عمارت کھڑی کر دی۔ اس طرح کی غلط وکالت سے اسلام کو جو نقصان پہنچا ہے اس قدر اسلام کے مخالفین کی مخالفتوں سے اس کو نہیں پہنچا۔ ظاہر ہے کہ اسلام کے کسی اصول کو صحیح عقلی و فطری دلائل سے نہ ثابت کر سکنا اس وجہ سے نہیں تھا کہ خدانخواستہ اسلام اپنے اصولوں کی سچائی کے عقلی و فطری دلائل نہیں رکھتا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ حضرات غیر فطری عقلیات سے اپنا مذاق اس قدر بگاڑ چکے تھے کہ اسلام کی عقلیت کی قدر و قیمت کو یہ پہچان ہی نہیں سکتے تھے۔ ایسی صورت میں ان کے لیے صحیح راہ یہ تھی کہ خواہ مخواہ کو اسلام کی وکالت کا ذمہ نہ لیتے بلکہ اپنے جن مشغلوں میں مشغول تھے ان میں مشغول رہتے لیکن دینِ آبا کی حیثیت سے اسلام کے لیے ان کے دلوں میں جو عصبیت تھی وہ انھیں مجبور کرتی تھی کہ وہ جس دین کا نام لیتے ہیں عقلی اصولوں پر اس کی سچائی ثابت کریں۔ اسلام کی عقلیت ان کے فسادِ مذاق اور قرآن سے محرومی کی وجہ سے ان کے دل کو اپیل نہیں کرتی تھی اس وجہ سے وہ مجبور ہوئے کہ اسلام کو اس عقلیت کے معیار پر پورا ثابت کر دیں جو ان کے زمانوں میں مقبولِ عام و خاص ہے۔ ان کی اس غلط کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کی محکم اور سچی تعلیمات کی ساری عمارت اس کی اپنی چٹان سے زیادہ مضبوط بنیادوں سے ہٹا کر دوسروں کی بالکل کمزور اور پھس پھسی بنیادوں پر کھڑی کر دی گئی۔ ان حضرات نے یہ کوشش کتنی ہی نیک نیتی سے کی ہو لیکن اس کے نتائج نہایت ہی خطرناک نکلے۔ زمانہ کے امتداد اور افکار و حالات کے انقلاب نے جب وہ نظریات بے حقیقت ثابت کر دیے جو کل تک مقبولِ عام تھے تو اس کی زد لازماً اسلام کے ان اصولوں پر بھی پڑی جن کو ان غلط نظریات پر ڈھالنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس طرح ہمارے متکلمین کی بدولت اسلام کے متعلق بہتوں کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ جس طرح وہ نظریات پرانے ہو گئے اسی طرح اسلام بھی پرانا ہو گیا۔ یہ سوءِ ظن پیدا کرنے میں جس طرح ہمارے پرانے متکلمین نے حصہ لیا ہے اسی

طرح ہمارے نئے متکلمین نے بھی اس میں حصہ لیا ہے اور اس میں بنیادی غلطی جو چھپی ہوئی ہے وہ یہی ہے کہ حق کی حمایت کے لیے ان لوگوں نے حق کو کافی نہیں سمجھا بلکہ اس کے لیے باطل کا تعاون ضروری سمجھا۔ حالانکہ حق کے معنی ہی یہی ہیں کہ وہ ثابت اور محکم ہوتا ہے اور عقل و فطرت کے اندر اس کی جڑیں نہایت دور تک پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ لیکن ہمارے متکلمین یونانیوں کے بتائے ہوئے طریقہ فکر و استدلال کے اتنے خوگر ہو چکے تھے کہ وہ قرآنی طرز استدلال کی باریکیوں اور خوبیوں کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ حالانکہ اگر وہ استدلال کی ان خلاف فطرت روشوں کو چھوڑ کر قرآن اور پیغمبر کے حکیمانہ طرز استدلال کو سمجھنے کی کوشش کرتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ قرآن کے ہر دعوی کی بنا ایسے محکم دلائل پر قائم ہے جو زمان و مکان کی تمام قیود و حدود اور انقلاب آراء و افکار کے تمام اثرات سے بالکل آزاد ہیں۔

۴۔ داعیان حق کے طرز استدلال کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے اور اپنے مخاطب کے درمیان قدر مشترک تلاش کرکے اس کو بنائے بحث و استدلال بناتے ہیں۔ ہر گوشہ میں خواہ مخواہ اپنی انفرادیت اور یکتائی کے اظہار کی کوشش نہیں کرتے۔ نوع انسانی اپنے ظاہری اختلافات کے لحاظ سے کتنی ہی بے میل، متفرق اور پراگندہ کیوں نہ نظر آئے لیکن اس کے اس تفرق اور پراگندگی کی تہ میں بے شمار اصول و عقائد ایسے بھی ہیں جن میں سب متحد ہیں۔ آفاق کے قوانین و ضوابط، تاریخ کے مسلمات، فطرت کے یقینیات و بنیادی اخلاقیات میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن میں شرق و غرب اور عرب و عجم سب ایک ہی نقطہ نظر رکھتے ہیں اور اگر ان کو بحث و استدلال کی اساس قرار دے کر اس بات کی سعی کی جائے کہ منطقی طور پر ان اصولوں سے جو باتیں لازم آتی ہیں لوگ ان میں بھی متفق اللفظ ہو جائیں تو یہ بات ان لوگوں کو اپیل کرتی ہے جو نیک نیت اور سلیم الفطرت ہوتے ہیں۔ زندگی کے جو اصول مشترک ورثہ کی حیثیت رکھتے ہیں ان کے لوازم میں جو اختلاف ہوتا ہے وہ اکثر سوء فہم اور تقلید سے پیدا ہوتا ہے اور اس کو کوشش کرکے اگر مٹا دیا جائے تو ہر شخص ان کو مشترک ورثہ ہی کی حیثیت سے قدر و عزت کی نگاہوں سے دیکھنے لگتا ہے۔ حضرات انبیائے کرام نے ہمیشہ یہی طریقہ استدلال و حجت کے لیے اختیار کیا ہے۔ عرب کے مشرکین اور اہل کتاب پر جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اتمام حجت فرمایا ہے اس کی تمام تفصیلات قرآن مجید میں موجود ہیں۔ اس کو پڑھتے ہوئے کہیں یہ گمان نہیں گذرتا کہ ان سے کسی ایسی بات کا مطالبہ کیا

کیا جا رہا ہے جو ان کے لیے بالکل نادر اور انوکھی ہو۔ اور ان کی تاریخ، ان کی روایات، ان کے معروف و منکر اور ان کے عقائد و اخلاق میں اس کی اصل موجود نہ ہو۔ اختلاف جو کچھ نظر آتا ہے وہ صرف اصول کی تعبیر اور ان کے لوازم و نتائج میں نظر آتا ہے اور اسی کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالبہ تھا کہ اصول و جزئیات میں جو تناقض پیدا ہوگیا ہے لوگ اس کو دور کرلیں۔ اگر وہ بات حق ہے جو قرآن مجید کہتا ہے تو اس کو مان لیں اور اگر وہ بات حق ہے جس کے وہ مدعی ہیں تو اس کو صحیح ثابت کردیں۔ اس طرز استدلال کا فائدہ یہ ہے کہ داعی کے متعلق یہ بدگمانی نہیں پیدا ہوتی کہ یہ کوئی ایسا شخص ہے جو اپنی انفرادیت کے زعم میں تمام ماضی پر خط نسخ پھیرنا چاہتا ہے اور اپنی شخصیت کا سکہ جمانا چاہتا ہے بلکہ یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ ہمارے ہی اگلوں کا ورثہ ہماری طرف منتقل کرنے آیا ہے۔ اور اگر کچھ لوگ شرارت کی وجہ سے بدگمانیاں پھیلانا بھی چاہتے ہیں تو زیادہ عرصہ تک نہیں پھیلا سکتے۔ اصل حقیقت کا آفتاب نمودار ہوکر بہت جلد ان ظلمتوں کو کافور کردیتا ہے۔

جو لوگ اہل حق کے اس طرز استدلال کی خوبیوں اور فوائد سے واقف نہیں ہیں ان کا طرز عمل بالعموم اس کے بالکل ضد ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ قدر مشترک تلاش نہیں کرتے بلکہ جو قدر مشترک انھیں ملتا ہے اسے بھی نقطہ اختلاف بنا دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ان کے استدلال اور ان کی دعوت کی اصلی خوبی ہی یہی ہوتی ہے کہ دنیا کے کان اس سے ابتک بالکل ناآشنا رہے ہیں۔ اور آسمان کے نیچے بالکل پہلی مرتبہ انھوں نے اس کو آشکارا کیا ہے۔ ہمارے بہت سے ناظرین جو اسلامی دعوت کے صحیح مزاج سے واقف نہیں ہیں وہ بالعموم اس طرح کے خبط میں مبتلا ہیں۔ وہ اسلام کی کسی حقیقت کو جب بھی پیش کرتے ہیں اس کا اصلی کمال اسی بات میں سمجھتے ہیں کہ اس کو نادر ترین ثابت کریں۔ یہ چیز قدرتی طور پر طبائع میں انس کے بجائے اس سے بیزاری پیدا کرتی ہے اور لوگ بجائے اس کے کہ اسے اپنی چیز سمجھ کر اس کا شوق کریں اسے اجنبی چیز سمجھ کر اس سے نفرت کرنے لگ جاتے ہیں۔

۵۔ داعیان حق کے طرز استدلال کی پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ وہ الزامی طریق استدلال جواب کبھی اختیار نہیں کرتے۔ الزامی طریق استدلال سے ہماری مراد وہ نہیں ہے جس کو ہم اوپر استدلال باللوازم کے

عنوان سے ذکر کر چکے ہیں بلکہ اس سے ہمارا اشارہ ہمارے مناظرین اور متکلمین حال کے اس غلط طریقہ کی طرف ہے جو عموماً وہ موجودہ معترضین اور نکتہ چینوں کے مقابل میں اسلام کی حمایت کے لیے اختیار کرتے ہیں۔ ان کا مقبول عام طریقہ یہ ہے کہ جہاں کسی مذہب والے نے اسلام کی کسی بات پر اعتراض کیا وہ ...... جھٹ اسی قبیل کی مثالیں اس مذہب کی تعلیمات کے اندر سے پیش کرنا شروع کر دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح انھوں نے اسلام کو اعتراض کی زد سے محفوظ کر لیا۔ حالانکہ یہ بات اصولی طور پر غلط ہے۔ دوسرے کی کسی غلطی کی بنا پر ہماری کسی غلطی کا حق ہونا تو الگ رہا ہمارے کسی حق کا حق ہونا بھی مشتبہ ہو جاتا ہے۔ اس طریق استدلال کا فائدہ اگر کوئی ہے تو زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ معترض چپ ہو جاتا ہے اور اس سے ہمارے غرور نفس کو تسلی ہو جاتی ہے لیکن اس سے نہ تو مخالف کو اسلام کی حقانیت کا ثبوت ملتا نہ خود اپنے آپ کو اس سے شرح صدر حاصل ہوتا بلکہ یہ الٹے اپنی کمزوری کا نہایت کھلا ہوا ثبوت ہے جو ہم خود اپنی زبان سے دوسروں کے لیے ہم پہنچاتے ہیں۔ ہر امر حق اپنی دلیل خود اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس کی دلیل دوسرے کی کسی باطل کے اندر نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے صحیح طریقہ صرف یہ ہے کہ اس کے دلائل خود اس کے اندر سے پیش کیے جائیں۔ اس معاملہ میں ہمارے متکلمین کی روش غلط ہونے کی وجہیں دو ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ مخالفین کے پروپگنڈے سے مرعوب ہو جانے کی وجہ سے بسا اوقات اسلام کے بعض نہایت سچے اصولوں کی سچائی خود ان کی نظروں میں مشتبہ ہو گئی اور انھیں ان کی حمایت کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار ہی نظر نہیں آیا کہ الزامی طریق جواب اختیار کر کے مخالف کو چپ کریں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ان حضرات نے اپنی وکالت وحمایت کی ذمہ داری صرف اسلام ہی کے حد تک محدود نہیں رکھی بلکہ قومی تعصب کے جذبہ کی وجہ سے انھوں نے مسلمان قوم کی پوری تاریخ کی حمایت بھی اپنے سر لے لی جس کی وجہ سے ان کا محاذ جنگ بہت لمبا ہو گیا اور انھیں بہت سی ایسی چیزوں کا حق ہونا بھی ثابت کرنا پڑا جن کو حق ثابت کرنا اس وقت تک ممکن ہی نہیں تھا جب تک وہ دوسروں کے بہت سے باطل کو بھی حق ثابت نہ کر دیں۔ ہمارے متکلمین کا وہ سارا لٹریچر جو گزشتہ نصف صدی کے اندر تیار ہوا ہے اور جس میں جہاد، غلامی، تعدد ازدواج، طلاق اور مسلمان سلاطین کے کارناموں کے جواز وغیرہ پر بحث کی گئی ہے وہ تمام تر اس صورت حال کی شہادت ہے اور اس کو پڑھ کر

(باقی مضمون صفحہ ۸۰ پر)

جو پیغام دے کر میں بھیجا گیا تھا وہ میں پہنچا چکا ہوں۔ اب میرا رب تمھاری جگہ دوسری قوم کو اٹھائے گا اور تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے۔[ل] یقیناً میرا رب ہر چیز پر نگراں ہے"۔

پھر جب ہمارا حکم آگیا تو ہم نے اپنی رحمت سے ہود کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے نجات دیدی اور ایک سخت عذاب سے انھیں بچا لیا۔

یہ ہیں عاد، اپنے رب کی آیات سے انھوں نے انکار کیا۔ اس کے رسولوں کی بات نہ مانی،[ع] اور ہر جبار دشمن حق کی پیروی کرتے رہے۔ آخرکار اس دنیا میں بھی ان پر پھٹکار پڑی اور قیامت کے روز بھی۔ سنو! عاد نے اپنے رب سے کفر کیا۔ سنو! دور پھینک دیے گئے عاد، ہود کی قوم کے لوگ۔

[ل] یہ ان کی اس بات کا جواب ہے کہ ہم تجھ پر ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

[ع] اگرچہ ان کے پاس ایک ہی رسول آیا تھا، مگر جس چیز کی طرف اس نے دعوت دی تھی وہ وہی ایک دعوت تھی جو ہمیشہ ہر زمانے اور ہر قوم میں خدا کے رسول پیش کرتے رہے ہیں۔ اسی لیے ایک رسول کی بات نہ ماننے کو سارے رسولوں کی نافرمانی قرار دیا گیا۔

(بقیہ مضمون صفحہ ۱۲) کبھی تو ان حضرات کی مرعوبیت اور بے بسی پر افسوس ہوتا ہے اور کبھی ان کی غلط روی پر۔ حالانکہ اگر وہ پروپگنڈے سے مرعوب نہ ہوتے اور خواہ مخواہ کو پرائے جھگڑے اپنے سر نہ لیتے بلکہ اپنی حمایت صرف اسلام ہی تک محدود رکھتے تو ان بہت سی بوالفضولیوں سے بالکل محفوظ رہ جاتے جن میں ان کو چار و ناچار مبتلا ہونا پڑا اور جن کی وجہ سے وہ اسلام کی خدمت کرنے کے بجائے اس کی دعوت کی راہ میں بہت سے کانٹے بو گئے جو ایک ایک کر کے آج ان لوگوں کو چننے پڑیں گے جو اس راہ میں قدم رکھنا چاہیں گے۔